گوریّاں کہاں چلی گئیں

مسرور جہاں

1.C، تھرڈ فلور، پارس اپارٹمنٹ، مہتاب جہاں، درگا دیوی مارگ، حسین آباد، لکھنؤ، موبائل:8176061060

کہاں پانچ ہزار گز پر بنا ہوا عالیشان مکان اور کہاں یہ ڈربہ۔ اس مکان کے سامنے تو اسے ڈربہ ہی کہا جائے گا۔ پچاس سال پہلے کا زمانہ ہوتا تو اس وسیع وعریض مکان کو حویلی کہا جاتا۔ حویلیوں کا چلن ختم ہو چکا تھا۔ اب تو کوٹھیاں تھیں یا بنگلے تھے یا پھر مکان تھے۔ وہ بھی اس خوبصورت عمارت کو مکان کہنے پر مجبور تھیں۔ ایک لائن سے بنے ہوئے ہال نما کشادہ کمرے۔ کمروں کے آگے لمبا چوڑا برآمدہ، برآمدے کے سامنے چبوترہ۔ پھر پانچ سیڑھیاں اُتر کر زمین کا قطعہ جسے صحن بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور اس قطعۂ زمین پر لگے ہوئے آم، امرود، لکھوٹ، آڑو اور فالسے کے درخت۔ ایک کونے میں کیلے کے پیڑوں کا جھنڈ، کھلی ہوئی جگہ پر سبزیوں کی کیاریاں، دیوار کے ساتھ چڑھی ہوئی سیم، ترئی، لوکی کی بیلیں جنھیں سہارا دینے کے لیے بانس کے ٹھاٹھر کھڑے کیے گئے تھے۔ چبوترے پر چڑھنے کے لیے جو سیڑھیاں بنی تھیں ان پر چاٹنا پام کی ناندیں رکھی تھیں اور چبوترے پر دو طرف کیاریوں میں دیسی اور ولایتی گلاب سے رنگ برنگے پھول کھلتے تھے۔ بیلا، سویتا، موگرا اپنی اپنی فصل پر خوب پھولتے تھے اور رات کی رانی جب مہکتی تو پورا مکان خوشبو سے معطر ہو جاتا۔ برآمدے کے دروں میں اندر اور باہر گملوں میں فرن، کروٹن، الپا کا اور پام کے سدا بہار درخت اپنی چھب دکھاتے تھے۔ برآمدے کے چھجوں پر لیڈی ہملٹن کی بیل چڑھی تھی۔ گلاب کی بیل کی یہ انوکھی قسم تھی اور سال بھر اس میں کپاسی رنگ کے پھولوں کے گچھے مسکراتے تھے۔

انھیں رہائشی کمروں کو سجانے سنوارنے سے زیادہ پیڑ پودوں سے پیار تھا۔ وہ ان کی دیکھ بھال میں اپنا زیادہ وقت گزارتی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے گڑائی کرتی، کھاد ڈالتیں اور ربر کا پائپ لے کر پانی ڈالتیں۔ جن پودوں کی پتیاں خوش رنگ اور نازک تھیں جیسے کروٹن، الپا کا وغیرہ۔ انھیں چھوٹے ہزارے سے نہلاتیں۔ یا پھر نرم ملائم کپڑے سے ایک ایک پتی صاف کرتیں۔ ان کا زیادہ وقت اپنے پیڑ پودوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ جھٹپٹا ہوتے ہی سیکڑوں گوریاں بسیرا لینے پیڑوں پر اُترتیں تو ان کی چہچہاہٹ سن کر ان کا دل خوشی سے بھر جاتا۔ صبح وہ گوریوں کے لیے دانہ ڈالتیں اور مٹّی کے کونڈوں میں صاف پانی بھر کر رکھتیں۔ صبح صبح جب گوریاں بھرّ امار کر پیڑوں سے اُتر کر دانہ چگتیں اور پانی میں چھپ چھپ کر کے نہاتیں تو انھیں روحانی خوشی ملتی تھی۔ خدا جانے ایک مٹھی میں سمانے والی بھوری چتکبرے پروں اور ننھی سی زرد چونچ والی ان گوریوں میں کیسی کشش تھی کہ ان کا دل مسرت سے بھر جاتا تھا۔ سال میں دو تین بار یہ گوریاں تنکا تنکا جوڑ کر گھونسلہ بناتیں، انڈے دیتیں اور جب انڈوں سے لال لوٹی جیسے بچے نکلتے تو مادہ گوریا ان کی ایسی دیکھ بھال کرتی کہ خدا کی قدرت کا قائل ہونا پڑتا۔ اگر کوئی شامت کا مارا کوا کائیں کائیں کرتا کسی پیڑ پر بیٹھ جاتا تو ساری گوریاں مل کر ایسا شور مچاتیں کہ اسے بھاگتے ہی بنتا۔ پہلے لال لال بوٹی پر ہلکے ہلکے روئیں آتے۔ رفتہ رفتہ یہ روئیں پروں میں تبدیل ہو جاتے اور بچے مکمل گوریا کا روپ دھار لیتے۔ شروع میں تو وہ اپنی ماں اور سنگی ساتھیوں کے ساتھ پیڑ کی شاخوں پر پھدکتے پھرتے۔ پھر ایک دن وہ بھی آجاتا جب وہ اپنی ساتھی گوریوں کے ساتھ لمبی اُڑان بھرنے لگتے۔ سال میں ایک بار ان گوریوں پر برے دن بھی آتے تھے۔ جب خزاں کے سبب پیڑوں کے پتّے زرد ہو کر گرنے لگتے تھے اور لنڈ منڈ پیڑ ان کی حفاظت سے مجبور ہو جاتے تھے۔ قدرت کا انتظام بھی مکمل ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے پیڑ نرم ملائم کونپلوں سے بھر جاتے اور گوریاں خوشی خوشی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتی پھرتیں۔

ایک دن پتہ چلا کہ مکان فروخت ہو رہا ہے۔ عذر یہ تھا کہ مکان کی دیکھ بھال مشکل ہو رہی ہے۔ چار ملازم بھی اس کی صفائی اور دیکھ

بھال کے لیے کم ہیں۔ اوپر سے بڑے بڑے کمروں کی دھٹی، جھانپ کی بنی ہوئی چھتیں اور لق ودق برآمدے کی چھت کو روکنے والے شہتیر اور کڑیاں بوسیدہ ہو چلی ہیں۔ انھیں تو کہیں بھی بوسیدگی نظر نہیں آئی۔ وہ کون سا یہ مکان اپنے میکے سے جہیز میں لے کر آئی تھیں جو مخالفت کرتیں۔ ان کی خاموشی کو گھر کے مالک نے نیم رضامندی سمجھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان کی خودداری نے انھیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ گھر کا مالک کس طبیعت کا ہے۔ اس کی سوچ یا فیصلہ بدلنا ان جیسی عورت کے لیے محال تھا۔ بھلا پتھر بھی کہیں پگھلتا ہے؟ مکان کا قلق انھیں کم تھا اپنے پیڑ پودوں سے جدائی کا غم زیادہ تھا۔ نیا مکان بھی اچھا خاصا کشادہ تھا، لیکن وہ اتنی دلبرداشتہ تھیں کہ انھوں نے پیڑ پودے لگانے کا خیال بالکل چھوڑ دیا تھا۔ دراصل پہلے والے مکان سے نئے مکان میں منتقل ہونے کا دورانیہ اتنا طویل تھا کہ اپنی دربدری کا غم بھی ٹھیک سے نہ منا سکیں۔ وہ سارے گملے جو کبھی قیمتی اور خوش رنگ پودوں سے لبالب بھرے تھے، سوکھ کر ختم ہو گئے تھے۔ یہی حال گلاب، بیلا اور رات کی رانی کا ہوا تھا۔ سبزیوں کا حشر بھی ایسا ہی ہوا۔ اب اس قطعۂ زمین پر رینڈی کا جنگل کھڑا تھا۔ جن لوگوں نے بڑے چاؤ سے اپنے گھر میں گملے سجائے تھے وہ چار دن بھی ان کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔ گھر کے ساتھ کئی دُکھ لیے چلے آئے تھے۔ نئے مکان میں پہلی رات کی صبح ہوئی تو انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ صحن میں نکل آئیں۔ باؤنڈری وال سے ملے ہوئے پلاٹ پر نیم کا چھتنار درخت کھڑا تھا۔ گوریاں نیم کے درخت سے اُتر کر ان کے صحن میں کچی زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ گوریاں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سنا تھا کہ نئے مالک مکان نے پرانے مکان کے سارے پیڑ کٹوا دیے تھے۔ خدا جانے غریب گوریاں کہاں گئیں؟ شاید ان کی طرح وہ بھی در بدر ہو گئیں۔

انھوں نے چاول کی ٹنکی سے کٹورا بھر کے چاول نکالے اور صحن کے نسبتاً صاف گوشے میں سارے چاول بکھیر دیے۔ پھر تانبے کے بڑے سے تسلے میں پانی بھر کر رکھا اور دور ہٹ گئیں۔ گوریاں بھرّ امار کر چاولوں پر ٹوٹ پڑیں۔ کچھ پانی پینے لگیں اور کچھ نہانے لگیں۔ پیڑ پودے نہ سہی۔ پھل پھول نہ سہی گوریاں تو ہیں۔ دل لگانے کے لیے ان کا سہارا بھی بہت تھا۔ گوریوں کی ننھی سی چونچ میں چاول کے سفید دانے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور پانی کے قطرے ان کے پروں سے پھسل پھسل کر گر رہے تھے۔ دوسرے دن انھوں نے دانہ منگوایا۔ مٹی کے کونڈے منگا کر اہتمام سے صاف پانی بھرا، کچی زمین کا ایک ٹکڑا صاف کیا تاکہ صاف ستھرا دانہ کھا کر گوریاں خوش ہو جائیں دراصل وہ یہ سارا اہتمام اپنی خوشی کے لیے کر رہی تھیں۔ سب نہ سہی۔ بڑے مکان کی کچھ تو رونق ان کے پاس تھی۔ ان کے اطمینان کے لیے یہ بھی بہت تھا۔

بہت عرصہ کے بعد بڑی بیٹی میکے آئی تھی۔ ماں تو خود ہی رواں دواں تھیں۔ بیٹی کہاں آتی؟ اس کے بچے بھی اب ذرا بڑے ہو گئے تھے۔ عمر کے ساتھ ان کی شرارتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ سونٹی تو اتنا شریر تھا کہ نت نئی حرکتیں کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ صبح وہ جیسے ہی گوریوں کو دانہ پانی دے کر ہٹتیں وہ ان کے پیچھے پڑ جاتا۔ کبھی دوڑ کر ان کے بیچ پہنچ جاتا کبھی دور سے کنکریاں مارتا اور ان کے اُڑنے کا تماشہ دیکھ کر خوش ہوتا۔ پہلے تو انھوں نے اسے پیار سے سمجھایا۔ پھر ٹافی کا لالچ دیا، لیکن اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ موقع پاتے ہی وہ گوریوں کو ستانے لگتا۔ انھیں اُڑا کر اسے بہت خوشی ہوتی تھی۔ اس کے لیے تو یہ ایک دلچسپ کھیل تھا۔ اس دن تو حد ہو گئی۔ نہ جانے کہاں سے اسے ایک لکڑی مل گئی۔ جیسے ہی نانی اِدھر اُدھر ہوئیں وہ دوڑا، دوڑا گیا اور گوریوں کے پاس جا کر لکڑی پٹخنے لگا۔ بے چاریاں پہلے تو اپنی جان بچا کر چوں چوں کر کے اِدھر اُدھر بھاگیں۔ پھر بھرّ امار کر اُڑ گئیں اور ڈھیر ساری مٹی اُڑ کر پانی کے کونڈوں میں گری۔ نہ دانہ کھانے کے لائق رہا نہ پانی پینے کے قابل رہا۔ وہ لکڑی کی پھٹا پھٹ سن کر کچن سے باہر نکلیں تو نواسے کی کرتوت، بلکہ بدمعاشی دیکھ کر انھیں سخت غصّہ آیا اور سونٹی کا کان پکڑ کر ایک تھپڑ کس کر لگا دیا۔ سونٹی روتا ہوا ماں کے پاس گیا اور نانی کی شکایت کی۔ بیٹی کو ماں کی مار نا گوار گزری، غصّہ بھی آیا اور سارا غصّہ سونٹی پر اُتار دیا۔ تڑ تڑ کئی طمانچے اس کے گالوں پر رسید کر دیے اور فوراً اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ انھوں نے بیٹی کی سرگرمی دیکھی، لیکن منھ سے ایک لفظ نہ کہا۔ نہ ہی اسے روکنے کی کوشش کی۔ بیٹی کو اُمید تھی کہ ماں کچھ لیپا پوتی کریں گی۔ ان کی خاموشی نے جلتے پر تیل کا کام کیا اور وہ اپنا بیگ لے کر بچوں کو ہنکاتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ انھوں نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا اور روز مرّہ کے کاموں میں مصروف ہو گئیں

جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، لیکن بار بار خیال آ رہا تھا کہ خدا جانے بے زبان پرندوں کو کھانے کے لیے کچھ ملا یا بھوکے پیاسے ہیں۔ جی نہ مانا تو پھر سے صاف دانے ڈالا اور کونڈے دھو کر صاف پانی بھرا، لیکن ایک بھی گوریا واپس نہیں آئی اور وہ صدمے میں اُلٹے سیدھے کام نپٹاتی رہیں۔ شام کے وقت گوریاں نیم پر بسیرا لینے آئیں تو ان کا موڈ بھی بحال ہو گیا۔

کچھ دن سے طوطوں کے دو جوڑے نیم کے پیڑ پر آ کر رہنے لگے تھے۔ انھیں ڈر ہوا کہ کہیں یہ طوطے گوریوں کے انڈے بچوں کو نقصان نہ پہنچائیں، لیکن وہ نیم کی اونچی شاخوں پر بسیرا کرتے اور صبح صبح اُڑ کر چلے جاتے۔ گوریاں نیچی نیچی شاخوں پر پھدکتی رہتیں۔ انھیں بھی اطمینان ہو گیا کہ ننھی منی گوریوں کو ان طوطوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان کے دانے پانی میں حصّہ بٹاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی غذا دانہ نہیں بلکہ پھل اور اسی قسم کی چیزیں ہیں۔

چھوٹی بیٹی کی زچگی کے دن قریب تھے۔ وہ بلڈ پریشر کی مریض تھی اور بھی مجبوریاں تھیں۔ انھیں نہ چاہتے ہوئے بیٹی کے پاس جانا پڑا۔ میاں نے اطمینان دلایا کہ وہ چڑیوں کے دانے پانی کا خیال رکھیں گے اوپر کے کام کا لڑکا بخوبی یہ ڈیوٹی انجام دے گا۔ بیٹی کے ہاں ولادت تو اصل خیر سے ہو گئی، لیکن وہ خود بیمار ہو گئی۔ پہلے تو اسے یرقان ہو گیا۔ پھر کمزوری نے جان آدھی کر دی اور انھیں دو مہینے اس کے پاس رہنا پڑا۔ خدا خدا کر کے انھیں اپنی بیٹی کی طرف سے اطمینان ہوا تو گھر واپس آئیں۔

صبح ان کی آنکھ کھلی تو عجیب سناٹا تھا۔ باہر نکلیں تو انھیں اپنا آنگن کچھ زیادہ ہی کھلا کھلا نظر آیا جیسے کسی نے سر پر تنا ہوا شامیانہ ہٹا دیا ہو۔ جی اچانک دھک سے رہ گیا۔ نیم کا چھتنار درخت غائب تھا اور ساتھ ہی گوریاں بھی۔ میاں نے بتایا کہ پلاٹ کے خریدار نے پیڑ کٹوا دیا ہے اور اب وہ یہاں اپنا گھر بنوائے گا۔ انھوں نے بجھے ہوئے دل سے کونڈوں میں تازہ پانی بھرا۔ زمین صاف کر کے دانہ ڈالا۔ انھیں اُمید تھی کہ گوریاں ضرور آئیں گی۔ اتنی جلدی اپنا ٹھکانہ تو نہ بھولی ہوں گی۔ صبح سے شام ہو گئی، لیکن ایک بھی گوریا نہیں آئی۔ خدا جانے ساری گوریاں کہاں چلی گئی تھیں۔ وہ ڈھنڈھار صحن میں کھڑی سوچ رہی تھیں۔ کیا ان کی طرح وہ بھی رواں دواں ہو گئی تھیں؟ ایک نئے ٹھکانے کی تلاش میں انھیں کہاں کہاں بھٹکنا پڑا ہو گا۔ ٹھکانہ مل بھی گیا ہو گا تو ان کی طرح دانہ پانی کا خیال کون رکھے گا؟

وہ دل گرفتہ سی صحن میں پڑے مونڈھے پر بیٹھ گئیں اور دور خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگیں۔

◆◆◆

سائنس کے دلچسپ مضامین

اس کتاب کے مصنف محمد خلیل بنیادی طور پر ایک سائنس داں ہیں۔ انھوں نے طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے زیر انتظام شائع ہونے والے میگزین ''سائنس کی دنیا'' کی ادارت کی ہے۔ وہ اس بات سے بڑی حد تک واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کس طرح کے سائنسی مضامین پیش کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو سائنس کی باتیں بتائی ہیں اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ سائنس کوئی مشکل موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے جو ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں اور باتوں باتوں میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی ترقیات نے انسانی زندگی پر بڑا مثبت اثر ڈالا ہے اور انسانی زندگی کے اکثر شعبے سائنس کے اثرات سے خالی نہیں ہیں۔ اس کتاب میں شامل بعض مضامین ایسے ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کریں گے۔

مصنف: محمد خلیل صفحات: ۸۰، قیمت: تیس روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی